

شیراز دستی کے ناول ”سسا“ کا تجزیاتی مطالعہ

Analytical study of Shiraz Dasti's novel Sasa

By Sajid Iqbal, Lecturer, Department of Urdu, Govt. Postgraduate College, Chakwal.

ABSTRACT

Mind boggling incidents of post modernism left multidimensional and multifaceted effects on Urdu novels writing. Contemporary political, economical and cultural changes put a challenge before art of novel writing. in order to tackle these challenges, the novel writer of the present era expressing their artistic abilities in different ways. changes which occurred due to new world order made prominent the clashes between civilization many complicated questions are placed before universal and humanities values. Love which was an essence of man's existence is breathing its last. Rather it has become a rare phenomena. The same pangs of ending love is echoing on pages of novel "Sasa". The novelist tried to search at in between the comparison and clashes of two divergent civilization. The novelist described opt expressions which were really needed to express the feeling of love.

Key words: Sasa, Love, Post modernism, Civilization, Values, World order.

محمد شیراز دستی اردو ناول نگاری میں ایک نیا نام ہے۔ فکشن کی دنیا میں ان کی آمد یکسانیت کے ماحول میں ایک خوشگوار جھونکے کا احساس دلاتی ہے۔ ان کا ابتدائی ناول ”سسا“ ان کے فکری رتبے، عصری معلومات، تہذیبی آگاہی اور تاریخی شعور کا اظہار یہ اور ثبوت ہے۔ انھوں نے ناول میں نہ صرف معاشرت، مذہب، زندگی، زبان،

لیکچرر، شعبہ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، چکوال

عشق و محبت، اخلاقیات اور تاریخ جیسے متنوع موضوعات کے ذیل میں اپنے تصورات و نظریات پیش کیے ہیں بلکہ ان میں باہمی ربط کے رشتوں کی دنیا بھی تخلیق کی ہے۔ یہ بعینہ وہی دنیا ہے جس کا ہمیں تجربہ ہے اور جس میں ہم رہ رہے ہیں لیکن ربط کے ان رشتوں کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں یا ان کو اہمیت دینے سے یکسر انکاری ہوتے ہیں۔ یوں ناول نگاری کی روایت میں ان کا ناول موضوع، اسلوب اور کردار نگاری کے حوالے سے نئے امکانات تازگی اور توانائی کو لیے ہوئے ہے۔ اس ابتدائی ناول میں ہی ان کی فنی گرفت اور پختہ کاری عیاں ہو جاتی ہے۔ شیراز دستی انگریزی ادب کے استاد ہیں لیکن اردو زبان میں ناول لکھ کر انھوں نے نہ صرف اپنی زبان پر اعتماد کا اظہار کیا ہے بلکہ اردو زبان کی نئی تازگی سے بھی متعارف کروایا ہے۔ وہ جو کہانی پیش کرنا چاہتے تھے اور جس پس منظر اور کلچر کے ساتھ کرداروں اور مناظر کو جوڑنا چاہتے تھے، اردو اس کے لیے بہترین وسیلہ اظہار ثابت ہوئی ہے۔

ناول ”ساسا“ (جو کہانی میں پرندے کا نام ہے) حقیقت میں تلاش محبت کی کہانی ہے جو اپنے جلو میں مشرق و مغرب کی تہذیبی آویزش کے ساتھ ساتھ سیاسی، معاشی، ثقافتی، تہذیبی اور میڈیائی حقیقتوں کے بہت سے نقوش ہمارے دل و دماغ پر مرسم کر دیتی ہے۔

تلاش محبت کے لیے سلیم (ہیرو) کا داخلی اور خارجی سفر اصل میں دو تہذیبوں کے داخل اور خارج کا سفر بھی ہے۔ ناول میں بدلتے ہر منظر کے ساتھ اسکول ماسٹر کا سوال (محبت کہاں ہے؟) نئے نئے پیرائے کے ساتھ اس کے ذہن پر اترتا ہے اور ہر منظر اور ہر چہرے کے خارجی عکس میں وہ اس کو مقدس فرض سمجھ کر تلاشتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ مجھے کبھی کبھی ماسٹر جی پر غصہ آتا تھا، اگر اتنا ہی مشکل تھا تو مجھے کیوں دیا یہ سوال؟ میرا اتنا وقت برباد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے کیا معلوم محبت کہاں ہے؟ کبھی کبھی مجھے لگتا محبت نام کی کوئی چیز خدا نے پیدا ہی نہیں کی۔ ماسٹر جی نے جھوٹ بولا۔ مجھے تنگ کرنے کے لیے کہہ دیا کہ یہ بھی گاؤں کی ان چیزوں میں شامل ہے جو گم شدہ ہیں... مگر پھر سوچتا کہ تلاش جاری رکھنے میں کیا حرج ہے۔ میری زندگی میں جستجو تو ہے، لایعنی ساسہی کوئی سوال تو درپیش ہے۔^(۱)

ایک ذہن اور باریک بین قاری کے لیے یہ ناول ایک کھلی فضا کی طرح ہے جس میں تہذیبوں کا تصادم، شہری و دیہاتی ثقافتی بُعد، عدم مساوات، استحصال کا شکار محنت کش اور سوچوں کا تصادم سب وحدت کی شکل میں موجود ہے۔ غرض کیا ہے جو یہاں موجود نہیں۔ ناول کی تعمیر میں سب کی گنجائش اور آرائش اس طرح پیدا کی گئی ہے کہ ہر کہانی دوسری میں پیوست ہو جاتی ہے۔

ناول ”سسا“ پیچیس (۲۵) ابواب میں منقسم ہے۔ ناول میں ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک نوجوان سلیم (ہیرو) اور منزہ (ہیروئن) کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ پہلے باب میں سلیم کا بچپن اور ابتدائی تعلیم کے واقعات نمایاں ہیں لیکن دوسرا باب ایک دم یونیورسٹی کی تعلیم کے منظر نامے کو ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ ”سسا“ کے پلاٹ میں مختلف واقعات کی ترتیب اور ہم آہنگی بعض مقامات پر فطری معلوم نہیں ہوتی، تاہم تمام واقعات ایک بڑے منظر نامے کو ضرور واضح کرتے ہیں اور وہ بڑا منظر نامہ محبت کی تلاش کا سفر ہے۔ یہ سفر سلیم کے گاؤں سے شروع ہو کر اس کے گاؤں میں آ کر منزہ کو حاصل کر لینے پر ختم ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کر کے ان واقعات کو بھی ناول میں شامل کر لیا گیا جو شاید فطری ترتیب میں کبھی ناول کا حصہ نہیں بن سکتے تھے۔

حاجرہ ریحان کے بقول:

There are minor flaws in plotting and confusing timelines and occasional excesses in description of what constitutes beauty, but Dasti makes up for it with his good grasp of language and expression, knowledge of international politics and his detailed exposition of family loyalties.⁽²⁾

ناول میں مابعد جدید دنیا کے ان تصورات کی عکاسی خوب کی گئی ہے جو غریب، محکوم اور معاشی لحاظ سے کمزور قوموں کے لیے زہر قاتل ہیں۔ اکثر ان زہر آلود پروپیگنڈا تصورات کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ میڈیا کا غیر منصفانہ استعمال ان میں سے ایک ہے۔ نائن الیون (۹/۱۱) کے بعد پیش آنے والے واقعات اور ان پر میڈیا کی تبصروں نے تمام پاکستانیوں کو مشکوک بنا کر پیش کیا۔ نائن الیون (۹/۱۱) کے بعد ان تبصروں میں مغربی میڈیا نے اسلام اور اسلامی ثقافت پر بہت ہی گھٹیا انداز میں حملہ آور ہونے کی کوشش کی۔ اسلامی افکار پر سنجیدہ بحث کی بجائے ڈرامائی انداز میں اسلامی بنیاد پرستی کی جڑیں تلاش کی گئیں۔ اسلامی بنیاد پرستی کو پاکستان میں تلاش کر کے دنیا بھر میں ہونے والے ہر جرم اور ظلم کو انتہائی غیر منصفانہ انداز میں اسلام اور پاکستان سے جوڑ کر بدنامی کے دہریں کھینچا گیا۔ نئے ورلڈ آرڈر کے تحت مغربی میڈیا نے اسلام اور دہشت گردی کو ایک ہی سگے کے دو رخ قرار دے کر کڑی تنقید کی زد پر رکھا۔ خیالی سازشی تھیوریوں کا ایک ملغوبہ ہر ٹاک شوز میں زیر بحث لا کر اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کیا گیا، یوں اس نئے ورلڈ آرڈر کے تحت ہر مسلمان کا خون ارزاں ہو گیا اور اس کے جسم کے چھتھرے اڑانا جائز قرار پایا۔ پاکستان نے خاص طور پر نائن الیون (۹/۱۱) کے اثرات کی بھاری قیمت ادا کی۔ ناول نگار نے اس تمام منظر نامے کا خوب احاطہ کیا ہے:

نئے ورلڈ آرڈر میں قبلہ رخ نہ ہونے والوں کی سزا موت تعین ہوئی تھی۔ ساوہ اس اصول سے واقف نہ تھا سو اس سے فرعون وقت کی نماز قضا ہو گئی اور جو ایسا کرتے ہیں انھیں ٹھنڈی چھاؤں والی قبروں میں اترنے کا حق نہیں دیا جاتا۔ نئے نظام انصاف کی رو سے اس کے چیتھڑے اڑائے جانے تھے سو اڑائے گئے۔ ماتم کیسا؟ آہ و فغاں کیوں کر؟^(۳)

۹/۱۱ کے بعد کا منظر نامہ اتنا بھیانک تھا کہ اس نے غیر ممالک میں بسنے والے ہر پاکستانی کو گویا عصرِ کربلا میں پھینک دیا۔ انھیں ایسے سوالوں کے جواب بھی دینے پڑ گئے جن سے قطعی طور پر تعلق تھے۔ ناول میں سلیم کو انھی سوالات کے جواب تلاش کرنے نیز اپنے اور اپنی قوم کو حق بجانب سمجھنے میں ایک ہیجانی کیفیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر محفل میں سوالات کا ایک انجانا خوف اس کا پیچھا کرتا ہے۔ سلیم کو بطور پاکستانی جس غیر منصفانہ یلغار اور طعنہ زنی کے طوفان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ بہت ہی روح فرسا ہے۔ ہر محفل اور مجلس میں غضب ناک نظریں اسے باور کرواتے ہیں کہ تم دہشت گردی کے حامی ہو۔ گویا نسلی، مذہبی اور قومی شناخت اس کے لیے مسائل پیدا کرتی ہے۔ امریکی قوم جو اپنے لیے شناخت، حسنِ اخلاق اور خوب صورت انسانی اقدار کی توقع رکھتی ہے، حالات کا تناظر بدلنے اور میڈیا کی غلط بیانی سے اتنی شدید متاثر ہوتی ہے کہ اس کے یہ تمام پیمانے الٹ ہو جاتے ہیں:

میں اس غضب ناک کی کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ وہ میرے پاس آئی اور اپنے ہاتھوں کو میری طرف اُچھال کر کہا، ”بن لادن ان یور کنٹری، پاکستان، نات ان ایفگانستان۔“ میڈی کا کتا ٹوٹی بھی مجھ پر بھونکنے لگا۔^(۴)

ناول میں روایتی طور پر رشتے ناطوں کے تصور کو وفا کی ڈوری سے باندھا گیا ہے، وفا کا جذبہ آفاقیت کا روپ دھار کر تمام انسانی رشتوں میں نمایاں ہے۔ دلوں کی کدورت اور نفرت سستی مادہ پرستی سے دور نہیں ہو سکتی لیکن میدانِ وفا میں ثابت قدم رہنے سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہے۔ سلیم اور منزہ کے کردار میں اس حقیقت کو دیکھا جاسکتا ہے۔

ناول نگار نے ثقافت کا منظر نامہ بہت خوب صورتی سے سجایا ہے لیکن جب وہ مابعد جدید دنیا کے تناظر میں اسے دیکھتا اور سمجھتا ہے تو حقیقت کو پانے کی ساری جستجو گویا خواب ہو کر رہ جاتی ہے۔ حقیقتوں اور ابدی صداقتوں کو پانے کی لگن اور جستجو ایک عہد کا خواب ضرور تھا لیکن مابعد جدید دنیا میں اس سامان کو دھوکے کے سوا کچھ نہیں سمجھا جاتا:

حقیقت پسند ایڈیٹر کو میں کیسے سمجھاؤں کہ میری کہانی کی منزہ کے رویے دس ہزار میل دور سات سمندروں کے فاصلے پر اس مٹی سے پھوٹے ہیں، جہاں حقیقت کا ایک ہی مترادف ہے اور اسے وفا کہتے ہیں۔ وفا میں فنا ہوتے ہیں تو لوگ حقیقی بقا کا گوشوارہ بھرنے کے اہل ٹھہرتے ہیں۔ ان رویوں اور فیصلوں کو مادیت پرست اکائی سے ماپیں گے تو fantasy لگے گی۔^(۵)

مذہب، سیاست، معاشرت اور اخلاق میں تضادات اور دُہرے معیارات ہماری سوسائٹی کی نفسیات میں رچے بسے ہوئے ہیں۔ یہ عیوب اب اتنے عام اور غیر اہم ہو گئے ہیں کہ یا تو ہمیں یہ نظر ہی نہیں آتے یا پھر ہم جان بوجھ کر ان سے آنکھیں چُرا لیتے ہیں۔ معاشرتی توہمات جنہیں عقیدت کی حد تک عزیز رکھا جاتا ہے کوئی دھکی چھپی بات نہیں۔ ”ساسا“ میں ایسے تمام تضادات اور توہمات کی قلعی کھولی گئی ہے۔ ناول نگار نے بعض اوقات براہ راست اور بعض مقامات پر وقفے وقفے سے طنز و طعنے کے انداز میں معاشرتی عیوب پر نشتر زنی کی ہے۔ سماجی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے جتنے بھی رنگ اس ناول کی فضا میں ابھرتے ہیں بالکل فطری انداز میں سامنے آتے ہیں:

پاکستان سے ایک دوست نے ایک بکرے کی تصویر لگائی تھی جس پر اللہ لکھا ہوا تھا اور کپشن تھا اس تصویر کو شیر نہ کرنے والے پر اللہ کی ۱۰۰۰ بار لعنت ہو۔ ایک فرینڈ نے فیصل مسجد میں نماز جمعہ کا منظر لکھا تھا بہت بڑا اکٹھ تھا مومنوں کا روح پرور منظر تھا۔ بندے پر بندہ چڑھا ہوا تھا۔ لاکھوں لوگ تھے۔ کم سے کم پانچ سو لوگوں کی جبین کٹ گئیں۔^(۶)

ناول میں کرداروں کی الجھنیں خوشیاں اور نفسیاتی رویے سب ان کے ماحول سے جڑے ہوئے ہیں۔ سب کرداروں پر ثقافت و کلچر کی چھاپ ہے۔ پرانے دیس میں رہنے والا سلیم بھی اگرچہ انگریزی بولتا ہے انگریزوں سے دوستیاں کرتا ہے۔ انگریز لڑکیوں سے محبت کی پیٹنگیں بڑھاتا ہے لیکن اس کی سوچ اپنے ماحول اور دیہی کلچر سے ایک لمحے کے لیے بھی جدا نہیں ہوتی۔ اپنا اور جینی کے ساتھ اس کے جذباتی تعلقات اس لیے کوئی نام اور مقام نہ بنا سکے کہ وہ ایک خاص تہذیب کا پروردہ ہے۔ یوں تہذیبی دیواریں ہر تعلق کے آگے بند باندھ دیتی ہیں۔

خدایا مشرق و مغرب کے درمیان کوئی تیسرا جہاں کیوں نہیں ہے؟ جہاں محبت!! جہاں ہم سے پروانے محبتوں کے پھول اُگاتے۔ کوئی ایسا جہاں جہاں تکمیل تمنا ہوتی۔^(۷)

جینی واینا اور ان کے ساتھ ساتھ متعلق افراد کی محبت وقتی اور لمحاتی تلذذ کا شکار ہے۔ یہاں بھی دو تہذیبوں کی سوچ اور دو مختلف قسم کے ماحول کا ٹکراؤ اور اختلاف ہے۔ ایک تہذیب میں زندگی بھر کا نباہ اور وفا، قابل قدر اور آفاقی جذبہ ہے۔ دوسری طرف ہر گزرتے لمحے کے ساتھ آنکھیں پھیر لینا کوئی قابل مواخذہ جرم نہیں بلکہ زندگی کا عمومی رویہ ہے۔

میں نے جینی سے کہا کہ اس کے والد بہت دلچسپ آدمی ہیں اور ان کی حس مزاح متاثر کن ہے۔ جینی نے مجھے دیکھا اور ہنس کر کہا کہ یہ حس مزاح ہی تو ہے کہ می اب تک ان کے پاس ہیں، ورنہ وہ تو لیزبین ہیں اور مستقل اپنی گرل فرینڈ کو ڈیٹ کرتی ہیں۔^(۸)

نفسیاتی لحاظ سے سلیم کا کردار ایک جاندار کردار ہے۔ جو محبت کا متلاشی ہے۔ ناول نگار نے اس کردار کے ساتھ محبت کے بہت سے رنگ ملانے کی کوشش کی ہے لیکن نفسیاتی لحاظ سے اس کردار کے باطن میں بھی کئی تضادات ہیں۔ اگر اس کی زندگی میں اینا اور جینی کے علاوہ کچھ اور لڑکیاں بھی آئیں تو اس کے بازو شاید ان کے لیے بھی کھلے ہوتے حالاں کہ یہ کردار محبت کو متلاشتا پھرتا ہے لیکن یہ غور نہیں کرتا کہ محبت میں ہمیں بار بار ناکامی کیوں ہوتی ہے؟ کیا محبت کو پانے کی ہماری اپنی جستجو تو کھوٹی نہیں؟ کیا ہم بذات خود کوتاہیوں کا شکار تو نہیں۔ محبت کے جس آفاقی تصور کو ناول کی بنیاد بنایا گیا ہے وہ بعض اوقات خود احتسابی کے تصور سے تہی ہونے کے باعث کمزور پڑ جاتا ہے۔

ناول نگار نے ناول میں اکثر مقامات پر معاشی ناہمواریوں کے ماروں کی غربت کا نوحہ بہت خوبی سے لکھا ہے۔ غربت جس کی کوکھ سے محرومیاں، مجبوریاں اور مایوسیاں جنم لیتی ہیں، جو فاقہ کش کو مجرم اور بے کس کو گناہ گار کے روپ میں پیش کر کے تہی دست کر کے مارتی ہے کسی عذاب سے کم نہیں۔ ناول نگار نے غربت سے متعلق معاملات کو متن سے اس طرح متصل کیا ہے کہ قاری اپنے آپ کو ہر کردار کی جگہ بیٹھا دیکھتا ہے بلکہ وہ خود کرداروں کے باطن میں اتر جاتا ہے۔

میں نے اپنے گھر کے باہر گاڑی روکی تو کوئی پندرہ بیس بچے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ان میں سے اکثر شلواری قمیص میں سے کسی ایک چیز سے محروم تھے۔ یعنی غربت اب میرے گاؤں میں پہلے سے زیادہ خوش حال تھی۔^(۹)

ناول کے متن میں مرکزی موضوع کے تعلق سے ایسے سوالات بار بار اٹھائے گئے ہیں جو ماورائیت کے

حامل ہیں اور جن میں معروضی صداقتوں کو حاصل کرنے کی بے تاب تمنا ناول نگار کے پیش نظر ہے۔ یہ وہ سوالات ہیں جو عمومی نہیں لیکن ان میں تفکر و تدبر کا شیریں رس نچوڑ کر کچھ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناول نگاری کی تاریخ میں فلسفیانہ خیالات پیش کرنا غیر معمولی نہیں لیکن ہر وہ فکری پہلو اہمیت اختیار کر لیتا ہے جس میں جذب کا پہلو ہو اور جو ہمارا رخ مستقیم زندگی کی طرف موڑ دے۔ شیراز دستی رواروی میں قاری کو فکر کے ایسے ہی متنوع گوشوں سے متعارف کراتے چلے جاتے ہیں۔

اگر محبت کی معراج اسی محراب میں ہے جس نے میری تلاش کی سمت متعین کی تھی تو

پھر میں یہاں کیوں آیا؟

کیا کچھ لوگوں کی محبت کا مقصود اجنبیت ہوتا ہے؟

کیا محبت کا سرور پر اسراریت میں ہے؟

کیا محبت مہاجر ہے؟^(۱۰)

لیکن ناول نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ مرکزی موضوع یعنی محبت کی تلاش کے ساتھ تمام واقعات کو ایسے جوڑتا ہے کہ ناول میں رعنائی اور دلچسپی، کہانی کے اختتام تک باقی رہتی ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

کہانی کی مرکزی تھیم یعنی محبت کی تلاش قدیم ہونے کے باوجود اپنی آفاقیت کے باعث اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ اب یہ تلاش انسانی مقاصد کے دائرے سے ناروا طور پر معدوم ہوتی جا رہی ہے، معنویت سے بھرپور ہے اور جدید طرزِ اظہار کے باعث دلکشی قائم رکھتی ہے۔^(۱۱)

ثقافتی، سیاسی اور سماجی سطح پر جدید دنیا انتہائی بہیمانہ انداز میں استحصال اور فرسودگی کا شکار ہے۔ معاشی عدم مساوات اور سماجی نا انصافی کا ایک عمیق سمندر ہے جس میں عہد جدید کا ماحول ہچکولے لے رہا ہے۔ استعماری شکنجے نئے نئے انداز اور اختیارات کے ساتھ گسے جا رہے ہیں۔ بیروزگاری، بھوک اور افلاس کی ایک الگ دنیا ہے جب کہ دوسری طرف معاشی اور سماجی نظاموں پر قابض ایک اور دنیا بھی ہے جو انتہائی شدت اور بے رحمی کے انداز میں غریب قوموں کا خون نچوڑتی ہے۔

ناول میں استحصالی ذہنیت کے جدید ہتھکنڈوں کو مابعد اور جدید عہد کے تناظر میں دیکھا گیا ہے جس کی زد میں آ کر چھوٹی قومیتیں ہی کیا بڑے بڑے ممالک سرنگوں ہو جاتے ہیں۔

اس دنیا کے اکثر لوگوں کو اوسط درجے کی بیداری نصیب ہی نہیں ہوتی اگر ان میں

یہ صلاحیت ہوتی بھی ہے تو سماج کے ٹھیکے داران پر نشہ آور عطر چھڑک دیتے ہیں۔
نیند کے تنبوتان دیتے ہیں تاکہ سوچ بیدار نہ ہونے پائے، فکر ارتقا نہ کرے۔
زندگی ہوشیار نہ ہو جائے کہیں اگر ہوشیار خبردار ہو بھی جائے تو یہ سماج دار اسے
ہوشیاری کی اتنی لت ڈال دیتے ہیں کہ زندگی بھر پر یڈیں کر کر مر جاتا ہے۔^(۱۲)

ناول ”ساسا“ میں دو تہذیبیں پہلو بہ پہلو اور روبرو رکھی گئی ہیں۔ ناول نگاری میں یہ کوئی نئی بات نہیں، نہ
ہی کوئی نیا رجحان ہے۔ اس طرح کے کئی اور ناول بھی لکھے گئے ہیں جن میں تہذیبوں کا تصادم و تقابل دکھایا گیا
ہے۔ لیکن محمد شیراز دہی نے ناول میں تخلیقیت کی ایک شان پیدا کر دی ہے، جس کی وجہ سے موضوع روکھا اور
واقعات بے اثر نہیں رہے۔ خالدہ حسین کے بقول:

اسے واقعہ نگاری میں ایک واضح مگر اپنے اندر سچائی کی ایک ایسی کشش قرار دیا جا
سکتا ہے جو حقیقی معاشرے کا صحیح رنگ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر تخلیقی
سحر رکھتی ہے۔ مشرق اور مغرب کی تہذیب کا تقابلی مطالعہ بہت سے لکھنے والوں کا
موضوع رہا ہے مگر ”ساسا“ ہمیں دونوں تہذیبوں کے روزمرہ زمینی واقعات میں
نئی معنویت پیدا کرتا نظر آتا ہے۔^(۱۳)

سامراجیت کی بالادستی نے ہمیشہ ثقافتی بالادستی کے لیے راہیں ہموار کیں خاص طور پر نوآبادیاتی عہد تو ایسی
مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔ ثقافتی یلغار کے ذریعے ایک بنے بنائے نظام خیال کو تہس نہس کرنے کی کوشش کی گئی۔
یوں ان اثرات سے ہم آج تک آزاد نہیں ہو پائے۔ نوآبادیاتی عہد میں متعدد کلامیوں اور بیانیوں کو ذرائع ابلاغ
کے ذریعے رائج کیا گیا۔

حقیقی تخلیق کار سامراجی ثقافتی بالادستی کے مقابل اپنی ثقافتی شناخت قائم کرتا ہے۔ محمد شیراز دہی نے ناول
میں تہذیبی شناخت اور ثقافتی پہچان کو اہمیت دی ہے۔ پنجابی لفظیات سے مزین اسلوب کے ساتھ ساتھ اپنے
وسیب کی فطری جمالیات کے رنگارنگ نقوش ناول کی فضا میں قاری کے ساتھ محو کلام ہیں۔ کرداروں کی نفسیات
ایسی تخلیق کی گئی ہے کہ وہ ثقافت کی بازیافت میں فطری طور پر اور غیر محسوس انداز میں سرگرم ہیں۔

ثقافت کی بازیافت کے لیے جو طریقہ شیراز دہی نے برتا ہے، اس بابت ڈاکٹر ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

اہم بات یہ ہے کہ مصنف نے کہیں بھی اپنی ثقافت کے قصیدے پڑھے ہیں نہ
اسے مغربی دنیا کے مقابلے میں کم ترکہا ہے صرف فرق واضح کیا ہے اور کرداروں

کو ایسی نفسی وجودی صورت حال میں مقید دکھایا ہے جس میں وہ اپنی ثقافت کی بازیافت کو نجات کے مماثل تصور کرتے ہیں۔^(۱۴)

ناول میں دیہی معاشرت کے متنوع نقوش ہنستی بستی اور حیثی جاگتی زندگی کے ساتھ اس خوب صورتی کے ساتھ ناول میں کھپائے گئے ہیں کہ جن کا ازلی اور آفاقی حسن پورے ناول کی فضا کو شگفتہ اور تروتازہ کر دیتا ہے۔ فطرت کی تمام معصومیت ان مناظر میں جلوہ گر ہے جو ناول نگار نے ابھارے ہیں۔ یہ مناظر قاری کے لیے مانوسیت اور دل بستگی کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیقیت کا پرتو لیے ہوئے ہیں، جہاں زندگی پورے امکانات و مسائل کے ساتھ استقبال کرتی ہے، دامن دل کو کھینچتی ہے۔ دیہی زندگی میں نچلے، متوسط اور بڑے طبقات کی تہذیبی اور اخلاقی الجھنوں اور کشیدگیوں کو بھی خوبصورتی سے آئینہ کیا گیا ہے۔

ناول نگار کا فلسفہ محبت جو سماج، سیاست، جنس اور معاصر حقیقتوں کے بیچ پروان چڑھتا اور فروغ پاتا ہے، کامل و اکمل جذبوں کا متلاشی اور مقتضی ہے۔ ناول نگار نے اس بات کا اظہار تو نہیں کیا لیکن اس کے ہیرو (سلیم) کی محبت کے ادھورے واقعات اور تشنہ تکمیل رہ جانے والی اس کی امیدوں کا منظر نامہ یہ ضرور واضح کرتا ہے کہ میدان محبت میں اس کا واسطہ اکثر ادھورے لوگوں سے پڑا شاید یہی وجہ تھی کہ سلیم کی جذباتی وابستگیوں سوائے منزہ کے کسی کے ساتھ شاد کام نہ ہو سکیں۔ سلیم کے ہاں محبت کے نصاب میں جن اجزا کی ضرورت تھی وہ دور دیس جس نایاب تھی۔ اس کے معیارات کڑے اور انمول تھے۔

”اچھا تو پھر سنیے ماسٹر جی! محبت ہمارے ارد گرد ہر طرف ہے۔ نیچے کے پانیوں نے جو نیلا رنگ اوڑھا ہوا ہے نا وہ محبت کا ہے۔ ان بدلیوں کی اٹھیلیوں میں، صبا کی خنکی میں، گلوں کی خوش بو میں، ماں کی لوری میں، باپ کی دوڑ دھوپ میں، خزاں کی فصلوں میں، میمنوں کی مستی میں، ساری ہستی ہیں۔“^(۱۵)

”محبت قربانی دینے کا نام ہے، لینے کا نہیں۔ محبت نام ہی فنا ہونے کا ہے آزمانے کا نہیں۔“^(۱۶)

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ناول نگار نے ہیرو (سلیم) کو محبت کا متلاشی دکھانے کی کوشش کی ہے محبوب کا نہیں کیوں کہ محبوب میں محدودیت اور محبت میں آفاقیت ہے۔ یوں محبت کی تلاش ایک تہذیبی مرقع بن جاتا ہے اور یہ تہذیبی مرقع ناول میں فکری وحدت پیدا کر دیتا ہے۔

”ساسا“ کا اسلوب نہایت شستہ، شگفتہ رواں اور برجستہ ہے۔ لفظیات کا درو بست پروقار اور معنویت سے

بھرپور ہے۔ ناول میں واقعات جس تہذیب سے متعلق ہیں اسلوب بھی انہی کی نمائندگی کرتا ہے۔ مزاح کی چاشنی، طنز کی کاٹ، پنجابیت کا تڑکا، محاورات اور ضرب الامثال کا بر محل استعمال، تمثیلی رنگ غرض کہ سب ہی اس اسلوب کا حصہ ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تخلیق کار کی فطری صلاحیت اور تخلیقی اُچھ نے ناول کو سحر انگیز بنا دیا ہے۔ بقول ڈاکٹر نجیب عارف:

اس کا اسلوب جاندار اور منفرد ہے اس میں ایک جدت، ایک تازگی ہے، لفظیات اور نحوی ساختوں میں نیا پن ہے جو مقامی اور حقیقی ثقافت کا پر لطف ذائقہ عطا کرتا ہے۔^(۱۷)

ناول میں زبان کو خالص اردو کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اردو پنجابی اور انگریزی کے الفاظ کو حالات اور موقع کی مناسبت سے برتا گیا ہے۔ شیراز دستی بھی ممتاز مفتی، عبداللہ حسین، مرزا اطہر بیگ، قرۃ العین حیدر اور مستنصر حسین تارڑ کی طرح بالکل خالص اردو لکھنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ وہ کردار، ماحول اور حالات کی زبان لکھتے ہیں۔ بعض مواقع پر ان کا لہجہ پنجابی آمیز ہو کر دلچسپ تاثر پیدا کرتا ہے۔ ”سوچ سوچ کر خود کو نیم للا کر بیٹھا“،^(۱۸)

”روزہ پیر ہمیشہ روزے سے رہتے۔ لوگ انھیں وَنک وَنک کی اشیا پیش کرتے۔“،^(۱۹)

”تب تک نہیں رکا جب تک کہ روزہ پیر کے ایک فقیر نے غصے سے ”چپ کروے سوردا پترا“ نہیں کہا۔“،^(۲۰)

ناول نگار نے بعض مقامات پر تمثیلی پیرایہ اختیار کر کے ناول کے اندر رومانی اور داستانی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا اسلوب محبت کی تشنگی کا احساس لے کر ناول میں وارد ہوتا ہے اور محبت کے آفاقی تصور کو دلوں پر نقش کر دیتا ہے اس اسلوب میں محض نسوانیت کی توضیح اور تخصیص نہیں بلکہ ہر جذبہ بھلائی اور اخلاص کے رنگارنگ پھولوں کی مہک سے معطر دکھائی دیتا ہے۔ اس میں ایسا وجدانی حسن ہے جو کائنات کو خیر کے روپ میں دیکھتا اور ذہن کو تخلیق کے سرچشموں کی سیر کراتا ہے۔

اس جنت کے چار موسم ہیں۔ ایک میں پیار بویا جاتا ہے تو عشق کی فصل تیار ہوتی ہے۔ دوسرے موسم میں حسن بوتے ہیں منوں کے حساب سے رومان اٹھاتے ہیں۔ تیسرے میں شیرینی بو کر سُراٹے جاتے ہیں جب کہ چوتھا موسم جذبوں کے بونے کا ہے، جس کے آخر میں گلِ اخلاص پھوٹتا ہے۔^(۲۱)

ناول نگاری میں کرداروں کی اہمیت مسلم ہے۔ ناول نگاری میں زبانی اور انسانی احوال کرداروں کے ذریعے ہی پیش کیے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ناول نگار کا مشاہدہ مطالعہ اور تجربہ زندگی جتنا عمیق ہوگا وہ حیات و کائنات کی پیشکش اتنے ہی جاندار انداز میں کر سکے گا۔
ڈاکٹر شبیر قادری کے بقول:

کرداروں کی کامیابی اور پائیداری اسی میں ہے کہ ناول نگار ان کے منہ میں اپنی زبان ڈالنے اور انہیں لازمی طور پر فلسفی بننے پر مجبور نہ کرے بلکہ ان میں فطری بہاؤ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے حسب مقام و مرتبہ مکالمے ادا کرنے کے قابل بنائے۔^(۲۲)

کردار نگاری کے حوالے سے ناول ”ساسا“ میں دو بڑے کردار (سلیم اور منزہ) سب سے زیادہ ارتقا پذیر ہیں۔ تمام کہانی انہی دو بڑے کرداروں کے احوال و اعمال کے گرد گھومتی ہے۔ یہ کردار اپنے کلچر کے ساتھ شدید طور پر وابستہ ہیں۔ کہانی کے اختتام پر جس تجسس کے عالم میں دونوں کرداروں کا ملاپ کرایا گیا ہے، اس نے کہانی میں جان ڈال دی ہے۔ ناول کا خوب صورت اور خوش کن اختتام انہی دو کرداروں کے بھرپور ارتقا سے ممکن ہوا۔

ناول میں اسکول ماسٹر، جینی، اینا، بشکو نائی، نزہ موچی، امی جی، ضیاء الدین بلوچ، روزہ پیر، نک، علی، ساوا، رمظی وغیرہ جیسے کئی کردار ہیں لیکن ان میں بشکو، جینی اور اینا واقعات کے بدلتے تناظر میں نتیجے کے طور پر ابھرنے والے کردار ہیں اور اپنے کلچر کے اچھے بُرے خصائل کے دھارے پر رواں ہیں۔ بشکو استحصالی سوچ کا شکار ایسا محنت کش ہے جس کی زندگی دوسروں کے ہاں گروی رکھی ہوئی ہے۔ یہ ایک بشکو نہیں بلکہ بشکوں کی ساری برادری کا نمائندہ ہے جو معاشرے میں صرف بیگار لینے کے لیے خاص ذہنی سوچ کی زد میں رہتے ہیں۔

سادا اسم با مسٹی ہے۔ سادا ایسے افراد بھی سماج میں ہوتے ہیں جن کی زندگی اور حتیٰ کہ موت بھی ایک معمہ ہی رہتی ہے۔ یہ اس لیے کہ ایسے سادہ مزاجوں کی یہ دنیا نہیں، یہاں تو ذرا نگاہ کے چوک جانے سے جسم و جاں اور عزت و ناموس کے وہ گھائے اٹھانے پڑتے ہیں جن کی تلافی اس سماج میں ممکن ہی نہیں۔

اسکول ماسٹر، روزہ پیر، دیہی زندگی کا لازمہ ہیں اور ناول میں جو فضا تیار کی گئی ہے اس میں فٹ بیٹھتے ہیں۔ تمام کردار اپنے دائرے میں سرگرم عمل اور مکمل ہیں اور ایک خاص تہذیبی زندگی کے عکاس ہیں۔

”ساسا“ کے تمام کردار اپنے تمام تضادات و تفرقات کے باوصف اپنے ماحول اور سماج کے نمائندہ ہیں ان کی تمام خارجی اور باطنی کشاکش اپنے سماج کے اچھے بُرے رویوں سے جڑی ہوئی ہے۔ ماورائی فضا کی تخلیق ہو یا حقیقی حالات و واقعات کی پیش کش ناول میں کرداروں کی موجودگی اپنے آپ کو منوالیتی ہے۔ ناول میں کرداروں

کا حالات و واقعات پر رد عمل نیز مظاہر اور اشیا پر ان کے تاثرات انھیں زندہ اور جاندار بنادیتے ہیں۔
 ناول میں شیراز دستی نے جو تخلیقی زبان برتی ہے، اس کی وجہ سے کئی جملے ضرب الامثال اور اقوال زریں معلوم ہوتے ہیں۔ قاری کے لیے نصیحت آموزی، دل گدازی اور دلنوازی کا سامان بھی گویا موجود ہے۔
 ”ٹوٹے دل کبھی نہیں جڑ پاتے۔ پھر بھی دوستوں کا من کرتا ہے مداوا کریں۔“ (۲۳)
 ”مسکراہٹ مابعد الطبیعات کا مقناطیس ہوتی ہے۔“ (۲۴)

”ماں وہ بصر ہوتی ہے جو سکھی ایام کی تیاریوں کے ساتھ غم کے لمحوں کا سامان بھی جوڑتی رہتی ہے۔“ (۲۵)

”محبت کا میٹھا میٹھا شربت پلا سکنے کے قابل ہونے کے لیے جس پھل دار شجر کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی پنیری خود میں لگانی پڑتی ہے۔“ (۲۶)

”سسا“ میں کامیاب منظر نگاری کی وجہ سے دلچسپی اور خاص قسم کی تخیلاتی فضا قائم رہتی ہے جو قاری کو جکڑ کے رکھتی ہے۔ ناول میں دکھائے گئے تمام مناظر جیتے جاگتے اور رواں دواں ہیں۔ ہر منظر بولتا، چمکتا اور اپنی داستاں سناتا ہے۔ دیہی زندگی کے تمام مناظر میں بعینہ وہی لذت اور سحر کاری ہے جو اس فضا کا خاصہ ہے۔ اس دیسی فضا سے دور ایک تیز رفتار زندگی بھی دکھائی گئی ہے جو مادہ پرستی سے روشن ہے۔ برق رفتار زندگی کو دکھانے کے لیے جن لوازمات کی ضرورت تھی ناول نگار نے ان کو بھرپور انداز میں دکھایا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے کوئی سو ڈیڑھ سو گاؤں والے اپنی تہبندیں سیدھی کرتے، مختلف مقامات جلی و خفی کو کھلاتے، حقے کی چلم کو ٹھپکا رتے، آنکھیں ملتے، معدے کا غبار حوالہ ہوا کرتے، نیند میں گھلی ملی آوازوں میں منظمی کی ماں بہن ایک کرتے باہر نکل آئے۔“ (۲۷)

بے خیالی میں، میں نے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا۔ جینی نے خوف زدہ ہو کر مجھے دیکھا۔ ارد گرد کے تمام گاڑیوں والوں اور سامنے پیدل چلنے والوں نے بھی غصے سے مجھے دیکھا۔ اینا نے دیکھا غصے سے مگر جوں ہی مجھ پر نظر پڑی اس کا غصہ مسکراہٹ میں بدل گیا اور اس نے میرے ہارن والے سلام کا ہاتھ ہلا کر جواب دیا اور پھر ہاتھ کی درمیانی انگلی الگ کر کے غیر حرفی گالی بکی اور آگے بڑھ گئی۔“ (۲۸)

کامیاب منظر نگاری کا کمال یہ ہوتا ہے کہ منظر میں زندگی کا تحرک نظر آئے۔ یہ محض خیالی ہونے کا تصور نہ

دے بلکہ حقیقی زندگی کی حقیقی مثال نظر آئے۔

بحیثیت مجموعی ”ساسا“ تخلیقی فطرت کا دلچسپ کلامیہ ہے۔ محبت جیسے لازوال جذبے کو موجودہ دور کی مشینی زندگی نے گہنا دیا ہے لیکن ناول نگار نے اس جذبے کو تہذیبوں کی تہ میں اتر کر تلاش ہے اور کامیاب ٹھہرا ہے۔

حواشی

- ۱۔ محمد شیراز دہتی، ”ساسا“، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص ۱۹
- ۲۔ ہاجرہ ربیعان، *Bird in search of Love*، مشمولہ روزنامہ ”ڈان“، شمارہ ۳ نومبر ۲۰۱۹ء
- ۳۔ ایضاً، ص ۱۷
- ۴۔ ایضاً، ص ۱۲
- ۵۔ ایضاً، ص ۲۹
- ۶۔ ایضاً، ص ۵۵
- ۷۔ ایضاً، ص ۱۲۵
- ۸۔ ایضاً، ص ۹۸
- ۹۔ ایضاً، ص ۲۰۸
- ۱۰۔ ایضاً، ص ۱۲۴
- ۱۱۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف، فلیپ، ”ساسا“، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)
- ۱۲۔ محمد شیراز دہتی، ص ۱۹۵
- ۱۳۔ خالدہ حسین، فلیپ، ”ساسا“، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)
- ۱۴۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر، ”معاصر زندگی کی سیاسی، ثقافتی اور میڈیائی حقیقتوں کا استعارہ: ساسا“، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص ۴
- ۱۵۔ محمد شیراز دہتی، ص ۱۹۸
- ۱۶۔ ایضاً، ص ۱۶۲
- ۱۷۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف، محولہ بالا
- ۱۸۔ ایضاً، ص ۱۹
- ۱۹۔ ایضاً، ص ۴۴
- ۲۰۔ ایضاً، ص ۴۶
- ۲۱۔ ایضاً، ص ۹۲
- ۲۲۔ شبیر احمد قادری، ”ناول میں کرداروں کی اہمیت“، مشمولہ ”ادبیات“، اسلام آباد، خصوصی نمبر، ”اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ“، شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء، ص ۸۹

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۶

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۸

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۳۱

۲۶۔ ایضاً، ص ۵۴

۲۷۔ ایضاً، ص ۸۴

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۰۹

ماخذ

- ۱۔ حسین، خالدہ، فلیپ، ”ساسا“، لاہور: بکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء
- ۲۔ درویش، صلاح الدین، ڈاکٹر، ”انسان دوستی: نظریہ اور تحریک“، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء
- ۳۔ دتی، شیراز، ڈاکٹر، ”ساسا“، لاہور: بکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء
- ۴۔ عارف، نجیبہ، ڈاکٹر، فلیپ، ”ساسا“، لاہور: بکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء
- ۵۔ عبدالسلام، پروفیسر، ”اردو ناول بیسویں صدی میں“، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۳ء
- ۶۔ فاروقی، محمد احسن، ”ناول کیا ہے“، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۳ء
- ۷۔ مظہر، نعیم، ڈاکٹر/اسلم، فوزیہ، ڈاکٹر، ”اردو ناول تفہیم و تنقید“، اسلام آباد: ادارہ فروغ قومی زبان، مقتدرہ، ۲۰۱۲ء
- ۸۔ نیر، ناصر عباس، ڈاکٹر، ”معاصر زندگی کی سیاسی، ثقافتی اور میڈیائی حقیقتوں کا استعارہ“، مضمولہ ”ساسا“، لاہور: بکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء

اخبارات و جرائد

- ۱۔ ”ادبیات“، اسلام آباد، خصوصی نمبر ”اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ“، شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء
- ۲۔ روزنامہ ”ڈان“، شمارہ ۳ نومبر ۲۰۱۹ء
- ۳۔ ”نقوش“، لاہور، ”عصری ادب نمبر“، شمارہ نمبر ۱۲۹، ستمبر ۱۹۸۲ء

